ہمچو ادھم بحرِ حق با یک پیالہ جستہ اَم　　مثلِ قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہرِ اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ بابا عبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۱۰

توحید فکر

اپنے طور طریق، اپنے اصل اصول کے مطابق اگر یہ دنیا چل رہی ہوتی تو یورپ والے سب سے زیادہ حق رسیدہ ہونے چاہئے تھے کہ انہوں نے اپنی عقل کی معراج حاصل کر کے، سوسائٹی کے نظام کو ایک تہذیب میں رنگ کر اپنے نزدیک ایک مثالی معاشرہ بنایا ہے۔ حقیقت اس معاشرے کی اب خود ان پر ظاہر ہو رہی ہے اور وہ خود اس سے تنگ آ کر اس سے نبرد آزما ہیں۔ یہی کچھ اپنے معاشرے اور عوام کا حال ہے کہ ایک ڈھب پر زندگی گزارتے ہوئے انہیں یہی سب سے بہتر زندگی معلوم ہو رہی ہے۔ حالانکہ ایک سطحی عقل رکھنے والا بھی اس بے جان نظام کو بے کیفی سے دیکھے گا۔ اس نظام میں سوائے تن آسانی، نفانفسی، خود غرضی، بے اعتنائی، خود ستائی خود پرستی کے رکھا گیا ہے۔ اپنا حال یہ ہے اور جانچتے، اپنی میزان سے ان ہستیوں کو جن کی سطحی جسمانی زندگی تک ان دنیا کے ٹھیکیداروں سے کہیں زیادہ پُر خلوص، پُر حیا پُر صداقت طور پر گزر رہی ہے۔ خدا بچائے رکھے ہمیں اس تخیل سے کہ جس کے تحت اپنے سے بہتر کوئی دوسرا انسان نظر میں ہی نہیں جچتا اور عطا کرے وہ محبت بھری آنکھ کہ اپنا سب کچھ دوسرے پر قربان کر دینے کو دل چاہے۔

ہر زمانے کے فقراء کا رنگ نرالا، ان کی پہچان، ان تک رسائی بس عاجزی یا محبت کے انداز میں ہو سکتی ہے۔ جب فقیر، ظاہر میں بھی اپنی شان پر آ جائے تو اس کی توصیف آسان ہو جاتی ہے یا پھر پردہ کو لینے کے بعد دوسرے زمانے کے لوگوں کو یہ ظاہر کا حجاب درمیان سے اٹھ جانے پر کچھ اس کی خوبیوں اور لطافتوں تک رسائی ہو جاتی ہے مگر جو فقیر زندگی میں اپنے گرد حجاب در حجاب کر لے، کیونکہ حُسن کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جتنا حسین اتنے ہی پردوں میں، پھر اس تک پہنچ کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے باطن کی گہرائیوں میں۔ نورِ پنہاں کو اپنے قلب کے آئینہ میں ہی دیکھا جا سکتا ہے قلب کی صفائی اور جِلا کا ذریعہ محبت ہے اور محبت ہر چیز کی قدر ہی دیکھتی ہے محبوب میں۔ ایک ہی نورِ دو عالم کی جھلکیاں ہیں جو ان اجسامِ نور کے ذریعہ دنیا کے لوگوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ قسمتوں کی بات ہے کہ کون اس نورِ محمدی سے مستفیض ہو اور کس کی آنکھیں بند رہیں۔ بجلی کہاں گرتی ہے کس پر گرتی ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ زمانہ کبھی فقراء سے خالی نہیں رہتا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی گزرے ہیں تو ہر زمانے میں کم از کم ایک ولی ضرور موجود ہوتا ہے جو ان میں سے کسی نہ کسی کا رنگ لئے ہو اور بعض نبیوں خصوصاً حضور اکرمؐ کے رنگ پر تو ہزاروں لاکھوں ایک وقت میں موجود ہوتے ہیں۔ جب آسمانِ کائنات ان لاکھوں ستاروں سے جگمگا رہا ہو اور ہر زمانہ میں یہ لاکھوں ستارے موجود ہوں تو نورِ نبوت، نورِ محمدی کا فقدان زمانے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ ایک سیلاب نور زمانے میں موجود ہوتا ہے۔ یہ اپنی چاہ، طلب اور دُھن کی بات ہے کہ اس نور کا دامن ہاتھ آ جائے۔ فرد کی حد تک فقیر کا کام اور مشن یہ ہے کہ طالب کے باطن میں وہ فطری صلاحیتیں بیدار کرے جو اس کے ارتقائے باطن، روحانی ارتقاء کے لئے، قدرت نے اس میں ودیعت کی ہیں۔ ارتقائے روحانی ہی فقیر کا سب سے بڑا احسان ہے عالم انسانیت پر۔ یہاں کُن بہ امر ربی کی کار فرمائی ہے۔ مقامِ روح پر طالب کو سنبھال لینا ایک غواصِ ذات کا ہی کام ہے اور یہی خدمت خلق کے لئے رحمت اللعالمین کا حقیقی پرتو ہے وگرنہ واصل بالذات ہو کر، اپنی مستی میں کسی کو یہ فکر کہاں رہتی ہے کہ دوسروں کی بھی فکر واصل بالذات ہو کر، اپنی مستی میں کسی کو یہ فکر کہاں رہتی ہے کہ دوسروں کی بھی فکر

کرے۔ فقیر نسبت محمدی کے طفیل، اپنی ہستی سے گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ اتنا بے نفس ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے سوائے اُمتی اُمتی کے دوسری فکر نہیں رہتی۔ اسی لئے باطن کی اصلاح کر کے، فرد کو اپنی ذاتی خود غرضیوں، آرزوئوں، تمنائوں سے ہٹا کر، جمیع خلق کی جانب رجوع کر دیتا ہے۔ جمعیت کا درد، خلوص، خدمت، جمعیت کے لئے آنسو بہانا، زندگی وقف کر دینا، جان تک دے دینا اس کا وطیرہ بن چکا ہوتا ہے۔ کمالِ انسانیت ہی یہ ہے کہ مِن حیث الجمیعت، گروہ کے گروہ، اللہ کی جانب اس طرح رجوع ہوں کہ دل بہ یار دست بہ کار۔ اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل۔ اس طرح مرضیٔ امر الٰہی کے اجراء کا میدان یہی خلق ہے۔ اس خلق سے فقیر رابطہ کیسے توڑے۔ اس سطح سے شرعِ محمدی کا پابندی اور عالم خلق میں نشر حق ان فقرائے باطن کا ہی ذمہ ہے۔ یوں عام انسان اپنی زندگی میں ظاہر کا کوئی عمل کتنی ہی محنت اور مشقت سے کرے پھر بھی سطحی رہ جاتا ہے جب تک کہ اس کا تعلق قلب و روح کی سطح پر قائم ہو کر دائم نہ ہو جائے۔ اور جو چیز قلب و روح کی گہرائیوں تک اثر پذیر ہو سکے وہ عشق ہی ہے۔ عشق و محبت ہی خلوص، وفا، قربانی کا جذبہ قائم کراتے ہوئے نفس کی خود غرضیوں، خود طلبیوں سے نکال کر، انسان میں حسد، بغض، کینہ ہوس وغیرہ کی ظلمتیں ختم کراتا ہے۔ پھر ان کی جگہ خلوص، صداقت، وفا، خدمت، محبت، قربانی کا جذبہ ابھرتا ہے۔

اب کہیں انسان باشعور، تہذیب یافتہ، باشرع کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ بغیر قلب کے دھوبی گھاٹ پر نفس کے گندے کپڑے صاف کئے۔ طہارت اور پاکی کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ تقویٰ کہاں عطا ہو سکتا ہے اور اُس قدوسیت سے، جس کو دوام ہے، رابطہ قائم کہاں ہو سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں حیاتِ قلب و روح کہاں عطا ہو سکتی ہے۔

طالب دنیا فقیر سے چاہتا ہے کہ اس کے نفس اور دنیاوی ضروریات کی ساری خواہشوں کو پورا کرے۔ دعا دے، کرامت دکھائے اور جب یہ حاصل ہو چکا ہوتا ہے تو پھر طالب کو یہ فکر ہوتی ہے کہ روحانی طاقتیں ملیں۔ خلافتیں عطا ہوں، انوار و تجلیات دیکھے۔ مقام و منصب عطا ہو۔ الغرض طالب الجھ الجھ کر نفس کے چکروں اور بھنوروں میں گرفتار ہوتا رہتا ہے اور غواصِ حقیقت اسے ان طوفانوں سے نکال کر لطافتوں اور حقیقتوں کے سمندروں کی طرف رجوع کرتا ہے کہ یہ پانی کا قطرہ موتی بن کر کچھ دنیا کے کام آئے۔ یا بارانِ رحمت بن کر کشت زارِ انسانیت پر برسے یا پھر خود اس کی طرح عشق امت میں جل جل کر خود بھی شمع سوزاں بن جائے۔ اور زمانے کو بھی منور کر دے۔

انفرادی سطح پر قبلہ نے یہی کیا کہ ہر فرد کی باطنی خوبیوں پر ہی نظر رکھی۔ کسی نہ کسی سطح کا حسن کردار ہر شخص میں ہوتا ہے۔ خواہ وہ سطحی طور پر کتنا ہی بُرا نظر آ رہا ہو۔ قبلہ نے تقریباً ہر فرد کے ساتھ یہی کوشش کی کہ اس میں ایک خود اعتمادی، خدا اعتمادی سی پیدا کر کے اُس کو دنیوی جنجالوں سے نکال کر خلقت کے گلزار میں پھیلا دیں۔ عوام کے لئے سب سے آسان طریقہ خدمت خلق کے ذریعہ حق تک رسائی کا تھا۔ اس جانب انہیں رجوع کیا اور اس طرح ان کے حُسن باطن، ان کی اعلیٰ اقدار کو نکھارا۔ باطن کی راہ کھلنے کا سیدھا سا طریقہ، تھوڑا سا نور ڈال دینے کا ہے۔ پھر تاریکیاں خود غائب ہو جاتی ہیں عشق کی چنگاری ڈال دیں، آگ خود بھڑک اٹھتی ہے۔ یہ چنگاری ذکر بہ امر اللہ ہے۔ رانجھا رانجھا کہتے میں آپ ہی رانجھا ہوئی۔ یہ ذکر خفی ہے اپنے سے بھی خِفا میں۔ یہ ذکر روح کی سطح پر عطا ہوتا ہے اور جو عطا ہو وہ بغیر شیخ کے حکم کے واپس بھی نہیں لیا جا سکتا۔ یہ عطا کیا ہے، سوائے اس کے کہ شیخ خود اپنے کو عطا کرتا ہے۔ یہ اپنی مرضی سے عطا بھی نہیں کیا جاتا۔ سوائے حکم حق کے، پھر رُوح میں جب یہ ''کُن'' ہو گیا تو اپنی منزل الیہ راجعون پر گامزن ہو گئے۔ اس ذکر کو حیا کے پسینے سے سینچا ہوتا ہے۔ سینچتے سینچتے جب سینہ سمندر ہو جائے تو ذاکر خود مذکور ہو جاتا ہے۔ الا اللہ کی نمود۔ فاذکرونی اذکرکُم۔ اس کے بعد محمد رسول اللہ۔ اس ذکر کی تصدیق ماحول کر رہا ہوتا ہے۔ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکرک۔

خواص کی سطح پر قبلہ کی یہی کوشش رہی کہ فقراء میں ایک توحیدِ فکر قائم کرائی جائے اپنی اپنی منازل، اپنے اپنے عروج، اپنے اپنے مقامات کی فکر سے کہیں زیادہ ضرورت اور اہمیت اس بات کی ہے کہ معراج والی تڑپ، امتی امتی فقراء میں عام کی جائے تاکہ اس امت بد نصیب کے دن پھریں۔ اس کے لئے عالم مثال سے وہ کچھ کر دیا جاتا ہے کہ امت کی ظاہری زندگی، کم از کم ہزار سال کے لئے اس کی تفسیر ہوتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم پورا ہو۔ اسلام کو اپنی راہِ فروغ نصیب ہو اور اسلام جو زمانہ کے لئے ہدایت و سلامتی کا پیغام بن کر آیا وہ بالآخر عالم میں پھر سے سربلند ہو۔ آخر صدیقین، شہداء اولیاء، اسی لئے تو زمانہ میں آتے رہے کہ مرکز حق بن کر، حق کے اجراء کی ضمانت بنتے چلے جائیں۔ حق کی اسی تجلی کی تلاش میں فقیر قریہ قریہ، کوچہ کوچہ گھومتا ہے۔ جہاں روشنی نظر آئی لو لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ جس آئینہ میں حق کے انوار نظر آئے اسی میں اپنے حُسن باطن کی جھلکیاں پاتا ہے۔ میدانِ فقر، میدانِ امر میں توحید فکر قائم کرانے کی اسے ایک ازلی بے چینی ہوتی ہے۔ اپنی اس پیاس کی تسکین کے لئے قبلہ نے تصنیفات کے ذریعہ اپنا پیغام خواص تک پہنچایا صالحین، عارفین، سالکین، مجذوبین سے ملاقاتیں کیں۔ جہاں گشتی کی۔ بیرون ملک اور ہم وطن فقیر اور فقراء کی صحبتوں میں اپنی فرصت کا بیشتر وقت گزارا، مزارات پر حاضریاں دیں اور اسی جذبے میں کہ فقم قم یا حبیبی کمتہ نامی (اٹھو اٹھو محبوب کب تک سوتے رہو گے۔)

روٹھے کو راضی کرنے کے لئے بہت سے جتن کئے۔ توبہ کے دروازے بند تھے تو چور دروازوں سے بارگاہِ رحمت میں رسائی کی کوشش کی اس لئے کہ یہ وہ سطح تھی جو ہر سطح سے بلند تھی۔ نیاز بے نیاز کرائی جس کی تفصیل علیحدہ کتاب میں درج ہے بھوکے کا پیٹ بھر جانا عین دعا کے مترادف ہے دس ہزار کو کھانا اس غرض سے کھلایا کہ شاید کوئی ایک واقعی بھوکا کھالے تو عرش کے دروازے کھل جائیں نزولِ رحمت ہو اور امت کے دن پھریں۔

ہمچو ادھمؒ بحرِ حق بایک پیالہ جُستہ ام　　مثل قرنیؓ دُرِ دیگر را تلاشے کردہ ام

در شبیہم بر دیارتؐ نسبتے آوردہ ام　　بہر امت تحفہ نور جمالت بُردہ ام

رحمت کی سطح سے ہی عالم امر، عالم روح میں نہ صرف اغیار کی چیرہ دستیوں سے قوم کو نجات مل سکتی تھی بلکہ اپنے اعمال کی وجہ سے جو اللہ اور اس کے برگزیدگان فقراء اور مجذوبین کے غضب میں جو قوم گرفتار ہے اس سے بخشش و نجات کی صورت ممکن تھی۔ رحمتی وُسِعَ علیٰ کُلِّ شیئ پر قبلہ کو اتنا یقین، بھروسہ اور اعتقاد تھا کہ بالآخر برسوں کی مسلسل جدوجہد سے ایک راہ نکال ہی لی اور بڑے بھروسے اور پہاڑ جیسے ایمان کے ساتھ کئی برس سے یہ فرمارہے ہیں کہ رحمت کی ہوائیں چل پڑی ہیں۔ لاریب فیہ۔ اسلام کا وہ روشن زمانہ آئے گا کہ ہوش نہ ہوں گے۔ یوں قوموں کی زندگیوں میں ہزار سال بھی کچھ نہیں ہوتے۔ تیس چالیس سال بھی نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں زمانہ دیکھ لے گا کہ اسلام اپنے جادۂ فروغ پر چل پڑا ہے البتہ شروع میں وہی سیدھی سادھی باطنی خوبیاں اُبھریں گی جو بدوؤں میں تھیں اور بعد میں کہیں اُس کی اصلی شان اور سچی شریعت و طریقت کا نکھار ہو گا۔ اس شریعت باطنی پر، سرِ دست ظاہر داری کا پردہ پڑا ہوا ہے اور لوگ ظاہر داری سے کوئی ارکان ادا کر کے اپنے کو سرخرو سمجھ بیٹھتے ہیں باطنی حسن حقیقت کو خود لوگ آئندہ زمانے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان جھوٹی مصنوعی عبادتوں اور ریاضتوں میں خود سے خلوص پیدا کرنے لگیں گے اس وقت کہیں اندر باہر کی ایکائی، ظاہر باطن کی توحید نصیب ہو جائے گی۔ اسی وقت کہیں نماز معراج المومنین ہو گی اور اسی وقت کہیں اللہ کے نور کو اس دنیوی زندگی ہی میں دیکھ لیں گے کیونکہ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہے۔

قبلہ کی چند ملاقاتوں کی صرف جھلکیاں اس جگہ پیش کر دینا ممکن ہے۔ ان ملاقاتوں کے پس پردہ یہ حقیقت ہے کہ فقیر جہاں جاتا ہے حکم کے تحت جاتا ہے اس کا ایک قدم بھی بے معنی نہیں اٹھتا۔ پھر عاجزی اور مسکینی کی چادر اوڑھ کر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اپنا پردہ ہی رہے۔ حق کی خود یہی شان ہے کہ اس نے اپنے کو پردے میں رکھ کر ہم کو ظاہر کر دیا۔ اب ھل جزاء الاحسان الاّ الاحسان اس کے سوا کیا ہو کہ خود پردہ میں رہ کر اس کا اظہار کر دیں۔ یہی عبدیت ہے یہی عبدیت (ادنیٰ غلامی) کہ خود کو ایک چھوٹا سا حقیر بندہ بنا کر دنیا کے آگے پیش ہو اور امت کے کاموں میں صاحبانِ امر کا رجوع ایک ہی توحید فکر کے انداز میں کرائے۔

پاکستان پہنچنے پر قلندر عبد السلام دہلی والوں کی نشاندہی پر پہلے داتا دربار لاہور حاضری دی۔ قلندر صاحب کا دیا ہوا عطر پیش کیا پھر پشاور میں مانس بابا سے سبزی منڈی میں ملاقات کر کے عطر پیش کیا اور چہل گزی پشاور میں شہداء کے مزار پر عطر پیش ہوا جو لوگ اس وقت حاضر تھے وہ شاید ہیں کہ جیسے مدینہ پاک کی کھڑکی کھل گئی ہو اور یہ حالت ہو۔

میخانہ پہ رحمت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے　　سنتے ہیں مدینہ سے صبا آئی ہوئی ہے

اس کے بعد فقراء سے ملاقاتوں اور اہل سلوک کے ساتھ صحبتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس کی صورت زیادہ تر برسوں روزانہ اہل ذوق احباب سے ہم مجلسی کی صورت رہتی اور ہفتہ عشرہ خصوصی قوالیوں کی محفل کی صورت میں جو شب بھر جاری رہتیں۔ ان ہی مجلسوں اور محفلوں کے ذریعہ ایک اچھی خاصی تعداد اہل ذوق کی پیدا ہو گئی جو دوسرے عوام کے لئے بھی ایک مثالی جماعت کے طور پر کچھ نہ کچھ اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ بزرگوں سے ملاقاتوں میں قابل ذکر تقریباً پشاور اور نواح کے تمام سالکین اور مجذوبین تھے جن سے قبلہ کی اکثر موانست ہوتی۔ مانس بابا، کمیٹی والے بابا، حسینی بابا بارکہ والے۔ پہلوان باباڈ بگری والے، بکری والے، بابا کمبل پور والے، صلاح الدین بابا، بگا بابا، سائیں چند اور بہت سے غیر معروف مجذوب جن کا پتہ لوگوں نے دیا وہیں جا کر ان سے ملے۔ اس تلاش میں پاکستان کے دور دراز علاقوں میں پہنچے۔ ہر مشہور مقام، ہر مشہور مزار پر حاضری دی۔ وہاں نہ صرف صاحب مزار بلکہ اہل خدمت سالکین، مجذوبین تک رسائی کی۔ پس منظر یہی دردِ امت تھا کہ فقر کی اس صدیوں کی میراث کو امت کا مستقبل سنوارنے کے لئے یک رخی عطا ہو۔ ایک توحید فکر باطن کے ان چراغوں کے ذریعہ قوم کو عطا ہو۔ داتا دربارؒ، میاں میرؒ، پاکپتن شریفؒ، عزیز مکیؒ، گولڑہ شریفؒ، بری امام، لعل شہباز، منگھو پیرؒ، شاہ نورانیؒ، بری امام، سلطان باہوؒ، میاں محمدؒ، سخی سلطانؒ، شاہ جمالؒ، چرم پوش، بہائوالدین ذکریاؒ، شاہ رکن عالم، کاکا صاحبؒ، چمکنی بابا، اصحاب باباؒ، جنیب بابا اور بیشمار مزاراتِ بزرگان دین پر حاضریاں دیں۔ فقراء میں چند ایک کے اسمائے گرامی ہی بیان ہو سکتے ہیں وگرنہ تعداد تو حقیقتاً اتنی ہے کہ یادداشت سے بھی باہر ہے۔ فقیر چرخہ خیل، حضرت نور بادشاہ، پیر تیمار پورہ۔ پیر صاحب گولڑہ شریف، حبیب الرحمان چترالی بابا، محمد اسمٰعیل بابا ملتانی، آدم بابا بغاوالے، بوڑھی بابا سیالکوٹ والے نرمے بابا، بہادر ملنگ، حبیب الرحمن برق، طارق میاں، طاہر میاں، سید ضیا جعفری، سید امیر شاہ، سایں دُر محمد، حمزہ شنواری، حکیم سید احمد علی، صوفی برکت علی سالار والا وغیرہم سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں بھی رہیں اور ایک وحدانیت فکر کا بھی مضبوطی سے قائم ہوتی چلی گئی جو آئندہ زمانے میں امت کے فکر و عمل میں یک رُخی قائم کرانے کی کسی نہ کسی طرح ضمانت بنتی چلی گئی۔ ۱۹۶۵ء سے دو سال قبل حضرت اسمٰعیل شہید کے مزار پر خصوصی حاضری کے بعد ان برسوں کی کوششوں کی پہلی کامیابی اس وقت نصیب ہوئی جب اِدھر سے اشارہ ملا کہ ہزاروں والوں کی غداری پر جو برسوں سے عتاب تھا اس کی معافی دے دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا کہ قوم پر جب وقت آئے گا تو شہدا ساتھ ہوں گے۔ اسی طرح حضور بابا قادر اولیاء کے حکم کے تحت جب قبلہ کا سیف الملوک جانا ہوا تو وہاں شاہِ اجناء کی طرسے وعدہ ملا

تھا کہ وقت پر سب ساتھ دیں گے۔ اس غیبی امداد کی شہادتیں جنگ ۶۵ء کے دوران جگہ جگہ سے ملیں۔ حضرت اسمٰعیل شہید کے مزار پر جب دوسری بار حاضر ہوئے تو عالم اسلام کے جھنڈے ہی جھنڈے دکھائے گئے اس کے دو ایک سال بعد ہی عالم اسلام کی وہ فقید المثال کانفرنس ہوئی جس نے آئندہ زمانہ کی اسلامی تاریخ کو ایک نیا رُخ عطا کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں پاکستان کی ابتلاء کے دور میں جب ہر جانب عالم مثال میں دریائے خون ہی نظر آیا تو پھر راہِ نجات کی یہی صورت نظر آئی کہ نسبت علی کے سہارے حضرت بو علیؒ کی نیاز جگہ جگہ کرائی جائے چنانچہ اس ضمن میں پشاور، مظفر آباد، کراچی، لاہور یہ نیازیں کرائی گئیں اور جس دردِ دل سے جگہ جگہ حاضرین نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے تو دعاؤں کی مقبولیت کی شہادتیں جگہ جگہ سے نصیب ہوئیں۔ اہل ظاہر اس نکتہ کو شاید ہی پکڑ سکتے ہیں کہ مختصر سی جماعت کی پُر خلوص دعا شب بدر کی آئینہ دار رحمت اللعالمین سائے خود ہی حیاتِ نو کی ضامن بن جاتی ہے اور وہ یوں کہ اپنی نفسا نفسی سے نکل کر ہی گروہِ امت کے لئے ایسی مضطرب کن حالت میں فریاد کے لئے ہاتھ بلند ہوتے ہیں۔ اب امت کی تاریخ کا پندرھویں صدی میں نیا باب ہی کھلنا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد یہ امت کی ابتلا کا چودہ صدی کا دور ختم ہو رہا ہے اور پندرہویں صدی وہ نقشہ پیش کیا چاہتی ہے جو فکر انسانی سے ہٹ کر بالکل اچھوتا حُسن امم کی جلوہ نمائی کے شایانِ شان ہو گا۔ حریصؐ علیکم بالمومنین رئوف الرحیم ایک زندہ حقیقت ہے۔ اور سب کچھ فیضانِ مصطفویؐ کے طفیل ہی عطا ہونے والا ہے۔ ہم کیا، ہماری کوششیں اور سوچ کی حدیں بھی کیا۔ نظر جیسے ہی اپنے سے ہٹ کر کسی اور کی رحمتوں کی کار فرمائی پر پڑنے لگے گی تو یہ راز بھی افشا ہونے لگے گا کہ خیر امت کی قسمت میں خیر کثیر عجب عجب انداز میں آئندہ زمانے میں عطا ہونے والا ہے۔ اس کی نشاندہی حال ہی میں قبلہ کو لاہوت لامکان کے شاہ نورانیؒ اور منوڑا کے بحری امام یوسفؒ پر حاضری میں دے دی گئی ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں سے باطنی سُرنگیں منبع انوار تک جا پہنچتی ہیں۔ فقر کے یہ وہ خزانے ہیں جن سے سیرابی حاصل کرنا ان ہی کے نصیب میں ہو سکتا ہے جن کے دلوں میں وہ سوراخ ہوں جن سے درد امت رس رس کر بارگاہِ رحمت میں پہنچتا رہتا ہے۔ فقیر کیا جب تک الفقر فخری کے اس راز کا شناسا ہو کہ اپنے مقامات اپنی منازل کیا جب تک اپنی معراج میں بھی سوائے امتی امتی کے دوسری طلب نہ ہو تو یہ قبلہ کی روح کی ازلی تڑپ ہی تو ہے جس نے باوجود جسم کی معذوری کے قبلہ سے یہ جہاں گشتی ساری عمر کروائی ہے اور آج تک اس سوز و طلب میں کسی قسم کی نہ کمی ہے نہ آگے کی امید بندھ جانے سے ایک قسم کی بے اعتنائی جو جگہ جگہ انہیں آج تک لئے پھرتی ہے اور جس میں آج تک وہی شدت ہے جو روزِ اول تھی۔ بقول حضرت بو علیؒ

ہر جا کہ می بری من بیچارہ می روم　　باشد عنانِ من بہ کفِ اختیارِ دوست

O

یہ توحید فکر بھی اپنی ایک یکتائیت، ایک وحدت لئے ہوتی ہے۔ وہ حضرت ادھمؒ کی طرح سمندر کو چھلنی بالٹی سے خالی کرنے کا عزم رائیگاں نہیں جاتا۔ رحمت حق ضرور ایسوں کو نوازتی ہے جو قرنیؓ جیسا دُرِّ یگانہ تلاش کرنے کی فکر میں ہوں۔ جو جستجوئے طلب میں اپنے نفس، قلب، روح کی تمام صلاحیتوں کو اسی لگن میں صرف کر دینے کی شدتیں رکھتے ہوں اور ناممکن کے تخیل کو سرے سے اپنی زندگی سے محو کر چکے ہوں۔ ایسوں کو خود بھی یگانہ اور یکتا ہونا پڑتا ہے۔ اور اسی لئے یہ عظیم شخصیتیں اپنے تنہائی در تنہائی کے سفر میں یکہ و تنہا ہی رہتی ہیں۔ ایسوں کی گہرائیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ غواصانِ حقیقت اپنے ہی اندر غوطہ زن ہو کر دُرِّ عینی حاصل کر لیتے ہیں۔ حق کی معرفت خود اپنی معرفت میں پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر کوشش دوئی ہے، یہاں اپنی جان، وجود سب صَرف کر کے دُرِّ عینی ہو جانا ہے۔ ساری وحدت اپنے میں سمو لے کر پھر کہیں دُرِّ عینی کے انوارِ زمانہ میں

پھیلائے جاتے ہیں۔ اب کہیں نورِ وحدت کا وہ مضبوط ستون تیار ہوتا ہے جس پر سارے ظہورِ وجود کی عمارت ایستادہ ہوتی ہے اور جو عشق محمدیؐ، نور محمدیؐ کی تابانی میں رُکن عالم بنتا ہے۔ رُکنِ عالم زمانہ کا وہ بوجھ اپنے اوپر اُٹھائے ہوتا ہے جس پر اگلی صدیوں کے قیام کا انحصار ہوتا ہے۔ حَیُّ وقیُّوم کے انوار، نُورِ محمدیؐ کی تابانی میں میزان، صلوٰۃ، قیام جیسی آیتیں اس حالت پر صادق اُترتی ہیں۔

مبارک ہیں وہ جن پر ان رموز کی فہم ہی منکشف ہو جائے خوش نصیب ہستیاں ہی ایسے کی یکتائیت فکر سے توحید فکر قائم کر سکتی ہیں۔ اور اپنا اپنا بوجھ کچھ اسی طور اُٹھا کر، ارکانِ دین فقر کی ادائیگی کا حق پُورا کر سکتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زمانہ کی گردش میں بے دست و پا ہو کر نہیں بہتے بلکہ جو زمانہ پر سوار ہوتے ہیں اور زمانہ کی رفتار بدلتے ہیں۔ ان ہی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر۔ یہی وہ ہیں جن کے اشاروں سے گردشِ افلاک تغیر پذیر ہوتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

قُطب شیر وصید کردن کارِاد　　باقیاں ایں خلق باقی خوارِاد

قُطب آں باشد کہ گردِ خود تند　　گردشِ افلاک گردِاد رود

(قطب شیر ہوتا ہے اور شکار کرنا اس کا کام ہے۔ دُنیا کے باقی لوگ اس کے شکار کا جھوٹن کھاتے ہیں۔

قُطب وہ ہوتا ہے جو اپنے گرد کھینچتا ہے اور آسمان کی گردش اس کے گرد اشارے پر چلتی ہے۔)

یہ سوزِ درونِ امت۔ یہ صاحب خدمت لوگوں سے ملاقاتوں کی نہ بجھنے والوں والی پیاس اسی توحید فکر کو عام کرنے کی غرض سے ہے جس کے تحت نسل انسانی کو باطنی راستوں سے وہ ہدایت اور روشنی ملے جو اُن کے اندر سے انفرادیت، نفس پرستی، حسد، بغض، کینہ، ظلم، بیداد کو ہٹا کر امن، آتشی، صلح جوئی، خلق، ایثار، محبت اور احترامِ آدمیت جیسی اعلیٰ اقداریں پیدا کر دے۔ اس طرح انسانیت کے گم گشتہ قافلہ کو بالآخر اپنی ارتقائی کڑیاں نصیب ہو کر منزل کا پتہ مل جاءے گا۔ اسلام تو زمانے میں پیامِ امن لے کر آیا ہے۔ سارے زمانہ پر احسان بن کر آیا ہے۔ اسلام کی باطنی خوبیاں باطن انسانیت سے ہم آہنگ ہیں اس لئے باطن انسانیت میں ہی تبدیلی لا کر یہ ارتقائی راہ ہموار کی جا سکتی ہے اور یہ کام اب کسی ایک فرد سے یوں نہیں ہو سکتا کہ یہ انسان کی جمعی کوششوں کا زمانہ ہے۔ فقر میں بھی اسی جمعیت بندی کی ضرورت ہے تا کہ صاحبانِ خدمت جو اس وقت حیات ہیں اور جو پس پردہ ہیں ان کے مشن کو یک رخی نصیب ہو دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنا مشن دوسرے کو سونپنا اور اس دوسرے کا حکماً اس فرض کو اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ سنبھالنا بھی فقراء کی سنت چلا آرہا ہے۔ قبلہ کی کئی بزرگوں سے آخری وقت میں ملاقاتیں اور کئی مزاروں پر خصوصی حاضریاں صرف اسی تعمیل حکم کے تحت ہوئیں کہ اُن روشنیوں کو زیرِ زمین دفن ہو جانے سے بچائے رکھنا ہے۔ بابا قادر اولیاءؒ۔ حضرت نور بادشاہؒ، حسینی باباؒ، نرے بابا، مانس بابا اور دوسرے بزرگانِ باطن کا بوجھ سنبھالے رکھنا صرف اسی توحید فکر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وحدتِ امر ایک ہی اکائی میں اس عالم رنگ و بُو میں کار فرما ہے۔ جب ایک شمع بجھتی ہے تو دوسری روشن کر دی جاتی ہے فقر کا یہ سلسلۂ جاریہ ہی باطن انسانی کی بنیادوں کو مضبوط کر کے اس شجر مبارکہ کی نشو و نما کا ضامن بنا رہتا ہے۔

O

یہ خواصِ امت میں یک نظری، یک خیالی پیدا کرنے کی برسہابرس کی کوششیں اسی لئے تھیں کہ اسلام کا طلوعِ فجر ہونا ہے۔ شمس حقیقتؐ کی تجلی اب بھی زمانہ پر اسی رحمت للعالمینی انداز میں ہو رہی ہے۔ کاش اپنی تاریکیوں اور اندھیروں سے نکل کر یہ اندھی قوم شمس حقیقت کی تجلی میں آ جائے۔ یہ دو ایک کی کوششوں کی بات نہیں۔ اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یوم عام حیاتِ انسانی کا موجودہ دَور بھی اس کی بین نشاندہی کر رہا ہے کہ یہ جمعی کوشش کا زمانہ ہے۔ اسلام کی فطرت اسی گروہ بندی اور جمعی انہماک کار کا سبق دیتی ہے۔ انفس اور آفاق دونوں راہوں میں قوم کے خواص کو جمعی عمل پیرائی کی ضرورت ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ہی مرکزِ عشق، ایک ہی منبع حیات و نور سے وابستہ ہونے کے بعد بھی فقراء تک میں انفرادیت کی لٹک کچھ اس طرح پیوست ہو کر رہ گئی ہے کہ اس کی جڑیں صدیوں پرانی نظر آتی ہیں۔ مقامِ فکر ہے کہ جمعی عمل کی خوبیاں مقبول اور مستحسن نظر آنے کے باوجود۔ اپنی اپنی انفرادیت سے ہٹ کر جمعی فلاح کی جانب اپنا رُخ موڑ دینا خواص تک کے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ اور اپنے اپنے مسلک سے ہر ایک کو ایسی وابستگی ہو گئی ہے کہ جیسے

چناں در بندگی خود ساختم من　　نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

پھر بھی قبلہ نے مختلف فقراء سے برسوں روابط صرف اسی مقصد کے لئے رکھے کہ آخر پانی کی حقیر بوند بھی بڑی بڑی چٹانوں میں سوراخ کر دیتی ہے اور صبر و تحمل کی یہ کوشش پیہم کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ان ملاقاتوں میں یہ ضرور رہا کہ کئی ایک صاحب نسبت اور باکمال بزرگ، اپنی اپنی سربلندی کی داد حاصل کرنے میں لگے رہے اور اپنا لوہا منوانے پر ہی قانع رہے یا اپنی اپنی روحانیت کی زور آزمائی آپس میں ہی کرتے رہے۔ نگاہ اتنی بھی بلند نہ ہو سکی کہ اسلام کے ظاہر باطن پر جو یہود و نصاریٰ و ہنود کی صدیوں سے یلغار ہے اسکا سدِّباب جمعی انداز میں نفس اور آفاق دونوں صدیقوں میں کر کے، قوم کو اس کی راہ فروغ پر گامزن کرانا ہے۔ آفاقی دائرہ عمل میں جس لطافت اور ذہانت سے ان بدخواہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یا تہذیب اور روشن خیالی کے نام پر اسلام کی فطری سادگی، غیرتِ دینی اور جذبہ جہاد کے نظریے کو یک سر ہماری زندگیوں سے محو کرا دیا اور عبادت و تقدس کا نام دے کر ہم کو انفرادیت کے اندھیرے غار میں دھکیل دیا۔ اُس تک ہماری خواص کی بھی نظر بند کرا دی۔ ہماری اجتماعیت کی اس طرح بی کنی کر کے ہم کو ذکر و فکر صبح گاہی میں مست کرا کے ہماری منزلِ فروغ سے دور کر دیا۔ ہماری صدیوں کی تاریخ اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ جذبۂ جہاد جو ہماری زندگیوں کا نصب العین تھا۔ اب ہم سے بالکل مفقود ہے۔ حالانکہ جہاد اور صرف جہاد ہی میں ہمارے وجود کی ساری صلاحیتیں ابھر آتی ہیں اور اجتماعیت صرف جہاد ہی میں مستحکم ہوتی ہے۔ یہی جہاد بالسیف کو اپنے تخیل تک سے محو کر دینا ہماری بربادی کا ذریعہ بن گیا۔ دیکھا جائے تو نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جمعی تفکر یہی جذبۂ جہاد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا ہی تو تھا۔ اسی جذبہ کے تحت سادہ لوح بدو تک اسلام کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانیں نثار کر دیتے تھے اور اسلام کا یہی جذبۂ سرفروشی تھا جس سے دنیا کانپ اٹھی تھی کہ ایسوں سے کون مقابلہ کرتا جو اپنی جانیں فدا کرنا جانتے تھے۔

اب ضرورت ہے کہ اپنے دشمنوں کی اُن چالوں کو پہچانیں جو ظاہر میں صدیوں سے انہوں نے ہمیں شربت کے انداز میں زہر دیا ہے۔ قوم اور خواص کو اس زہر کے مختلف رنگوں کی وضاحت کرنی ہے اور ان کا توڑ پیش کرنا ہے اور اس ظاہر کی سطح سے ہٹ کر باطن میں جو ان کے ماہرانِ روحانیت نے اجتماعی اور انفرادی کوششوں سے، ایک سحر و فسوں سا ہماری قوم کے عقل و دماغ پر کیا ہے اور خواص تک کے قلوب پر تسلط جمانے کی کوشش کی ہے اُس کا سدِّباب کرنا ہے۔ باطنی یلغار ظاہری یلغار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہ صرف وہی جانتے ہوں گے جن کی نظر ایک

مشفق ماں کی طرح اپنی قوم پر ہے۔ سوچیں کہ آخر کیا بات ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی قوم اتنی پراگندہ کیوں ہے۔ بے یقینی، نامرادی، بے بسی نے اقوامِ مسلم کو ایسا گھیر رکھا ہے کہ ان کے ذہن سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ہے۔ عشق مرکزؐ سے وہ محروم ہو گئے ہیں اور بے پرواہ بھی۔ دل کے میدان کا اس طرح اُجڑ جانا ایسی بربادی اور شکست ہے جو ہماری سلطنتیں تباہ ہو جانے سے کہیں زیادہ ہے سوچیں کہ جب دل کی دنیا ہی برباد ہو گئی ہے۔ عشق نبیؐ سے ہی ہم محروم ہو گئے تو رہ کیا گیا۔ اسی عشق مرکز کے طفیل تو ہماری حیات تھی، ہماری جاں نثاری تھی ہمارا فروغ تھا، ہمیں دوام تھا تو یہ نسبتِ محمدیؐ، یہ رشتہ، یہ ڈورا پھر سے مضبوط کر ادینا اگر فقراء کا کام نہیں تو کس کا ہے۔ اس کے لئے تو نہ وقت کی ضرورت ہے نہ اسکیموں کی۔ یہ تو قلوب میں انوار ڈال دینے کی بات ہے۔ جاء الحق و ذہق الباطل۔ جب نُور آیا تو تاریکیاں خود بخود غائب ہو جائیں گی ظاہری اور باطنی شیاطین کے سب فسوں ٹوٹ جائیں گے۔ قبلہ فرماتے ہیں اب مشکل سے دو سال ہی ہیں جن میں کچھ کرنا ہے۔ بار بار یہی صدا آ رہی ہے کہ تیاری کے لئے تمہارے پاس صرف دو سال ہیں اس لئے جلدی کرو۔ فقراء میں یہ پیغام دیا جا چکا ہے۔ عمل پیرائی ان کے اختیار میں ہے۔ جو بھی اپنا رُخ شمسِ حقیقت کی جانب کر لے وہی شمس حقیقت کی جھلک دینے لگے گا۔ تب ہی کہیں ادا ہو سکے گا۔

یہ ثُمَّ وجہ اللہ یہ فقیر ہُو اللہ ہوئی سرخروبندگی اللہ اللہ

☆...☆...☆